پروفیسر ہارون خان شروانی

عربوں پر اسلام کا اثر

اگر آپ مئی کے مہینے میں جب گرمی کی شدت ہو کسی زرخیز میدان میں جائیں تو عمدہ زمین ہونے کے باوجود وہاں آپ کو کوئی پھل پھول یا سبزہ نظر نہ آئے گا اور جگہ جگہ کانٹے دار درخت جیسے ببول اور بیری ضرور دکھائی دیں گے۔ اب ذرا کچھ عرصہ کے بعد اگست یا ستمبر میں پھر اسی میدان کو دیکھنے جائیں تو یہ دیکھیں گے کہ خدا کی رحمت نازل ہو چکی ہے۔ زمین کو ایک نئی زندگی مل چکی ہے۔ جہاں خس و خاشاک کے سوا کچھ نہ تھا وہاں لہلہاتے ہوئے کھیت اور سبزہ ہی سبزہ نظر آئے گا۔ اور یہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا کہ یہ وہی چٹیل میدان ہے جسے آپ نے کچھ عرصہ پہلے دیکھا تھا یہی کیفیت بعض قوموں کی بھی ہوتی ہے۔ خدا نے ہر انسان اور ہر قوم کو ترقی کرنے کی قابلیت ودیعت کی ہے لیکن اس کے لیے ضرورت ہے کہ کوئی نہ کوئی زبردست محرک ہو جو اس قابلیت کو ابھارے اور اس کے ذریعہ سے اپنی قوم کی خصوصاً اور بنی نوع آدم کی عموماً خدمت کرنے کی اہلیت پیدا کرے۔ اس محرک کی کارفرمائی سے پہلے ان لوگوں میں قابلیت اور اہلیت ضرور تھی لیکن چھپی ہوئی تھی اور اب اس محرک کی بدولت وہ ظاہر ہوتی اور اپنی بساط کے مطابق ان کی کارکردگی اور افادیت میں ایک تغیر پیدا کر دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس تغیّر کا معیار محرک کی قوت پر مبنی ہوگا۔ اگر یہ کمزور ہے تو اثرات بھی کمزور رہیں گے اور اس میں شدّت و قوت ہے تو یہ اسی قوم میں جو پہلے بے جان لاشہ کی طرح پڑی تھی اب ایک خاص قوت اور زندگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوگا۔

عربوں کی تمدنی تاریخ دو حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ ایک تو اسلام سے پہلے اور دوسرے اسلام کے بعد۔ یہ مسئلہ نہایت غور کا محتاج ہے کہ کس طرح ایک ایسی قوم کی چشم زدن میں کایا پلٹ ہو گئی جو ابتدائے آفرینش سے کس مپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ نہ وہ کسی دوسری قوم سے ربط و ضبط قائم کرنا ضروری سمجھتی تھی اور نہ کسی دوسری قوم کو اس سے کوئی زیادہ واسطہ تھا۔ ایران،

عراق، یونان، روما سب ہی کے کارنامے دنیا نے دیکھے سکندر بھی آیا اور چلا گیا۔ قیاصرۂ روما نے دُور دراز کے ملک فتح کیے۔ بدھ مت کی رَو ایشیائے کوچک اور مقدونیہ تک پہنچ گئی۔ لیکن شاید عرب کے بے آب و گیاہ اور لق و دق صحرا سے یہ سب مرعوب ہو گئے یا اس طرف نظر ڈالنا بے کار سمجھا۔

بلا شبہ کسی ایسی زمین کی طرح جو زرخیز تو ہو لیکن بارانِ رحمت سے محروم ہو سرزمینِ عرب کے باشندوں میں بھی ایسی خصوصیات تھیں جن پر اسلام جیسے زبردست محرک کے آتے ہی جلا ہو گئی۔ عربوں کی مہمان نوازی، وفائے عہد، بہادری، سردارِ قبیلہ کی عزت کرنے کا جذبہ، یہ سب خصوصیات نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان کی معاشرت میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ اپنے قبیلے اور اپنے حسب نسب کے اتنے دلدادہ تھے کہ کسی بستی یا کسی شخصیت کو اپنا مرکز تصور نہیں کرتے تھے، اور جو نیم متمدن ریاستیں موجود تھیں وہ دراصل کسی غیر عرب فاتح کی فتوحات کا باقی تھیں۔ حسب نسب اور شرافت و نجابت کے مبالغہ آمیز تخیل نے کچھ ایسا گھر کر لیا تھا کہ بعض قبیلوں میں لڑکی کا پیدا ہونا ایک مصیبتِ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ خودداری کے نہایت غلط معنی سمجھے جاتے تھے۔ یک جہتی نہ ہونے کی وجہ سے ذرا ذرا سی بات پر تلوار چل جاتی تھی اور یہ جھگڑا کئی کئی سال تک جاری رہتا تھا۔ ان کا مذہب بھی اسی قبیلہ واری نظام پر مبنی تھا۔ بُت پرستی اتنی بڑھ گئی تھی کہ خود خانہ کعبہ میں بجائے ایک خدا کے ۳۶۰ بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ پھر یہ بھی نہ تھا کہ ان بتوں کے ساتھ کوئی خصوصیت وابستہ ہوتی۔ بلکہ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی بڑا آدمی یمن، شام یا عراق گیا اور اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت بُت پوجا جا رہا ہے۔ بس واپس آکر اس نے اپنے قبیلے میں بے سوچے سمجھے ایسا ہی بُت بنایا اور اس کی پوجا شروع کر دی۔ اگر سفر میں پتھر کی مورت نہ ملی تو ریت کا ایک تودہ بنایا۔ اس پر اونٹنی کے دودھ کا چھڑکاؤ کیا اور لگے اس کے سامنے سجدے کرنے۔ شراب اور جوئے سے عربوں کو خاص انس تھا۔ اور جس کے پاس جوئے کے لیے پیسے نہ ہوتے وہ ڈاکہ ڈالتا اور جُوا کھیلتا۔

ظاہر ہے کہ ایسی قوم میں علم و فن کا کہاں پتہ ہو گا۔ لکھنا پڑھنا شاذ تھا۔ یمن میں تو پھر بھی حبشہ کے قرب کی وجہ سے تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا رواج تھا لیکن شیوع اسلام کے

وقت تمام ملکِ حجاز میں صرف ۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور قوم کی قوم ان پڑھ ہونا باعث فخر سمجھتی تھی۔ شعر گوئی میں عرب یکتا تھے۔ اور مرد ہی نہیں عورتیں بھی شعر کہتی تھیں۔ لیکن یہ اشعار اس قدر فحش اور رہزلیات سے بھرے ہوتے تھے کہ آج کے کسی گئے گذرے معاشرے میں بھی یہ کسی ثقہ محفل میں نہیں پڑھے جا سکتے۔

غرض یہ کہ عربوں میں بہت سے نقائص تھے۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ ان میں اچھے اوصاف بھی تھے۔ جیسے بہادری، قبیلے کے ساتھ محبت، مہمان نوازی اور عصبیت، جن سے صحیح طور سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ اور سوائے حضرت ابراہیمؑ کے جنھوں نے عربوں میں ایکا کرنے کی کوشش کی تھی کوئی دوسرا ایسا محرک پیدا نہیں ہوا تھا جو ان چھپے ہوئے جوہروں پر صیقل کرتا ایسی صیقل کہ جاہل اور وحشی عرب دنیا کے معلم بن جائیں اور دنیا کی بیشتر آبادی کو اپنے رنگ میں رنگ دیں۔

اسلام نے عربوں کی کایا پلٹ دی، کسی ملک یا قوم کی ترقی کے لیے سب سے اہم چیز نظم و ضبط ہے اور یہ بغیر کسی مرکز کے ناممکن ہے۔ نظم و ضبط سے یہ مراد نہیں کہ انسان کی خودی کو مار دیا جائے بلکہ صحیح نظم تو وہی ہے جس میں انسان کی آزادی بھی برقرار رہے۔ اس زبردست محرک نے جسے اسلام کہتے ہیں ایک طرف تو عربوں کو یہ سکھایا کہ تم میں وحدت، یگانگت اور ایکا ہونا چاہیے اور تم آپس میں بھائی بھائی ہو۔ اور ساتھ ہی سب لوگوں کو بڑے بڑے شیوخ سے لے کر غلاموں تک، یہ بھی سکھایا کہ تم سب ایک خدا کے بندے ہونے کی وجہ سے آپس میں برابر ہو اور کسی کو کسی پر تفوق حاصل نہیں۔ اس انتہائی پابندی اور انتہائی آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں میں ایک زبردست اور عظیم الشان حرکت پیدا ہو گئی اور پہلے تو صرف ملکِ عرب یک جان ہو کر متحد ہوا اور پھر اس نے تہذیب و تمدن کے ان انوکھے تصورات کو اپنا کر انھیں چار دانگِ عالم میں پھیلا دیا۔

یہ ایک عجیب و غریب واقعہ ہے جس کی تاریخِ عالم میں مشکل سے کوئی مثال مل سکتی ہے کہ وہی عرب جن میں کسی زمانہ میں صرف ۷ آدمی نفوذ بہت لکھنا پڑھنا جانتے تھے، انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے علوم و فنون کا ایسا سکہ جمایا کہ ہندوستان سے لے کر اسپین تک

قریب قریب تمام ملکوں میں مادری زبان عربی ہو گئی۔ ہر ملک میں عربی علوم کی زبردست اشاعت ہوئی اور سب کا رسم الخط عربی ہو گیا۔ اس زبان کے سانچے میں دنیا بھر کے علوم ڈھل ڈھل کر نکلنے لگے۔ ایک عربی کے عالم (فلسفی بوعلی سینا) کا مرتبہ ارسطو کے بعد ہی سمجھا جاتا ہے۔ حدیث کے ذریعہ سے علم اسناد کو ایسا درجۂ کمال کو پہنچایا کہ اس سے تاریخی اسناد کا معیار قائم ہوا۔ پھر ریاضی، ہندسہ، ہیئت، کیمیا، طبیعات جیسے علوم کے ساتھ ساتھ پارچہ بافی، جہاز سازی، اسلحہ سازی، زراعت، طب اور جراحت جیسے فنون کو حیرت انگیز ترقی دی۔ غرض کونسا ایسا علم یا فن ہے جس میں وہ بام ترقی پر نہیں پہنچے۔ عربی زبان کو بے انتہا ترقی دی۔ ادب، صرف و نحو، کلام، بلاغت، عروض، تجوید، تشریح، تفسیر سب میں ایجادات کیں اور اس طرح دوسری زبانوں کے لیے بھی ترقی کا راستہ صاف کر دیا۔ عربی زبان ایک ترنم آفرین زبان ہے۔ چنانچہ عربوں نے اس خصوصیت کو بھی آگے بڑھایا اور اس قوم میں ایسے ایسے موسیقی دان اور مطرب پیدا ہوئے کہ جن پر ساری دنیا فخر کر سکتی ہے۔

میدان جنگ میں بھی عربوں نے اپنے تمدن اور اپنے مسلک کی حفاظت کے لیے بڑی جان توڑ کوششیں کی ہیں۔ انہی آباؤ اجداد کے جانشین جو اونٹنیوں کی خاطر بیسیوں برس تک اپنے بھائیوں کا خون بہانے سے گریز نہ کرتے تھے، شیر و شکر کی طرح آپس میں مل گئے اور متحد ہو کر ہندوستان سے لے کر فرانس اور سوئٹزرلینڈ تک تمام عالم کو زیر کر لیا۔ وہ جسمانی اعتبار سے ہی فاتح نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے قوموں کے دل بھی فتح کر لیے اور انھیں عجمی سے عربی بنا دیا۔ ایسے ایسے ائمہ اور علما جن کے نام آج کروڑوں لوگ عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ مثلاً امام بخاری، امام غزالی، امام ابو حنیفہ، امام رازی، ابن رشد، ابن خردادبہ اور سیکڑوں دوسرے لوگ ایسے ہیں جو عرب تو نہ تھے لیکن عربی چولا ایسا پہنا تھا کہ کوئی شخص ان کی تصانیف دیکھ کر یہ نہیں بتلا سکتا کہ یہ عجمی تھے۔ عربیت اقصائے عالم پر اس طرح چھا گئی تھی کہ جب یہ قوم اسپین سے بجبر و اذیت نکالی گئی تو بھی ایک مدت تک اس جزیرہ نما کے عیسائی اپنی نماز عربی ہی میں پڑھتے رہے۔ یہ نفوذ بزور شمشیر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ عربوں کے تمدن نے دوسری قوموں کے دل موہ لیے تھے اور آج بھی یورپی یونیورسٹیوں کا علمی لباس تقریباً خالص عربی جبہ ہے۔

قوانینِ جنگ کے سلسلے میں جو آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی بے دردی سے توڑے جاتے ہیں، یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شاید دنیا میں عرب ہی وہ پہلی قوم ہے جس نے جنگی قیدیوں کے ساتھ انسانیت کا سلوک روا رکھا۔ اور محض پڑھنا لکھنا سکھا دینے پر انھیں رہا کر دینا اپنا ایک قابلِ قدر اصول بنایا۔ جس چیز سے آج ہماری مشرقی بہنیں جھجکتی ہیں اور جو یورپ میں گھر گھر عام ہو گئی ہے۔ یعنی بیماروں اور زخمیوں کی تیمارداری، مرہم پٹی اور نرسنگ اس کی ابتدا کرنے کا سہرا بھی دراصل عربوں ہی کے سر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بدر اور اُحد کے میدانوں میں بڑی بڑی شریف عرب خواتین میں سے کوئی مشکیزہ سے زخمیوں کو پانی پلا رہی ہے۔ کوئی مرہم پٹی کر رہی ہے۔ کوئی کسی زخمی کو پیٹھ پر لاد کر کسی محفوظ مقام کو لے جا رہی ہے۔ اس میں بہت ہی کم شبہ ہے کہ انیسویں صدی میں جنگِ کریمیا کے موقع پر فلورنس نائٹ انگیل نے اپنی ہم قوموں کو جو نرسنگ سکھائی تھی اس کا درس اسے اسی عربی تمدن کے جاں نثاروں یعنی عثمانی ترکوں نے دیا تھا۔

عربوں کی تاریخ ایسی درخشاں ہے جو کسی قوم کے لیے بھی تفاخر کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور آج بھی عربوں میں لطف و کرم، مہمان نوازی اور سادگی بدرجۂ اتم موجود ہے اور خود مجھے اس کا تجربہ ذاتی طور سے ہوا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں مجھے حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل ہوئی اور اس سفر میں عربی کردار کی عجیب و غریب مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ میں بمبئی میں جہاز پر سوار ہوا ہی تھا کہ سلطان ابن سعود کے سفیر شیخ ابراہیم الفضل نے جن کو میں اچھی طرح جانتا تھا مجھے بلایا اور کہا کہ میں آپ کو ایک صاحب سے ملانا چاہتا ہوں جو سلطان کے مقرب ہیں وہ بحرین، بمبئی اور پیرس میں موتیوں کی تجارت کرتے ہیں۔ ان کا نام شیخ القصیبی ہے۔ میں اپنے کمرے میں سامان کو ترتیب دینے میں مشغول تھا کہ یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھولا تو دیکھا کہ قصیبی صاحب کے سکریٹری کھڑے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شیخ نے آپ کو سلام کے بعد کہلا ہے کہ بحری سفر کے دوران میں آپ، اور آپ کے ساتھ والے سب لوگ شیخ کے مہمان ہیں۔ میں نے اس کو محض ایک رسمی بات سمجھ کر معافی چاہی اور یہ کہلا دیا کہ ہم اور آپ دونوں مسافر ہیں۔ میزبانی

نہایت تیزی سے میری طرف آ رہے ہیں۔ وہ بہت پریشان نظر آتے تھے۔ کہنے لگے کہ آپ نے کیا غضب کیا کہ ایک عرب کی دعوت کو رد کر دیا۔ یہ سمجھ لیجیے کہ اگر ان کی دعوت قبول نہ کی تو حجاز میں خدا نخواستہ آپ کو بڑی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ کسی عرب کے لیے اس سے زیادہ کوئی بات توہین آمیز نہیں ہو سکتی کہ اس کی دعوت کو رد کر دیا جائے۔ غرض یہ کہ مجھے یہ دعوت قبول کرنی ہی پڑی۔ میری اور قصیبی صاحب کی بڑی دوستی ہو گئی اور ان کی وجہ سے حجاز میں بہت آرام ملا۔

عربوں کی معاملہ فہمی اور سادگی کی بھی ایک مثال سن لیجیے۔ مدینہ طیبہ میں کسی کام سے میں وہاں کے مہتمم پولیس (ایس۔پی) مہدی بے کے پاس گیا۔ وہاں دیکھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر تین چار چھوٹے چھوٹے مقدمے ان کے سامنے پیش کیے گئے۔ ان کے فیصلے ہوئے۔ ڈگریاں جاری کی گئیں اور وہیں کی وہیں چکا دی گئیں۔ طائف کے جج شیخ احمد ابن علی النجار کے یہاں میں نے دو روز قیام کیا تھا، وہ فرماتے تھے کہ فوجداری مقدمہ کا دوران زیادہ سے زیادہ چار روز اور دیوانی مقدمہ کا دوران زیادہ سے زیادہ دس روز ہوتا ہے اور اس مدت میں شہادت، تجویز، مرافعہ، ڈگری کا اجرا اور تعمیل سب ہی کچھ ہو جاتا ہے۔ وکیل و بیرسٹر مفقود ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ امور شرعی کے استفسار کے لیے خود شیخ احمد کے پاس لوگ آتے تھے اور انھیں بلا فیس کے مشورہ دیا جاتا تھا۔

امانت کی یہ کیفیت دیکھی کہ مکہ معظمہ کے حرم شریف میں مغرب کی اذان ہوئی اور سب دکاندار جن میں صراف بھی شامل تھے اپنی اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کے نماز کے لیے چل دیے اور جب آئے تو ہر چیز جوں کی توں پائی۔ میں نے خاص طور پر صرافوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ چونکہ مکہ ایک طرح سے بین الاقوامی شہر ہے اور سارے دنیا ولایت کے لوگ آتے ہیں اس لیے صرافے کا بیوپار بہت عام ہے اور یہ دکانیں ملک ملک کے سونے چاندی کے سکوں اور نوٹوں سے بھری ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام جیسے زبردست محرک نے عربوں کی کایا ہی پلٹ دی اور وہ ابھی تک اس عظیم معلم کی تعلیم کو نہیں بھولے ہیں جس نے انھیں بنی نوع انسان کی ہمدردی اور عظمت و فضیلت کا سبق دیا تھا۔